© rasailojaraid.com

رحیم بخش شاہین

اقبال کا پسندیدہ معاشی نظام

انسان کے معاشی مسئلے نے اقبال کو شروع ہی سے بے چین کیے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی تصانیف میں "علم الاقتصاد" ایسی کتاب بھی شامل ہے جو شاید اُردو میں معاشیات پر لکھی جانے والی اولین تصانیف میں سے ایک ہے۔ پھر جب آپ یورپ تشریف لے گئے تو آپ کو اس مسئلے کی سنگینی کا زیادہ شدت سے احساس ہوا۔ اس وقت یورپ میں جاگیرداری نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام لے چکا تھا اور اس کے ظلم و ستم کی چکی میں پسنے والا مفلس و نادار طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ اس معاملے میں اقبال کے مخصوص ذہنی رویے کا جائزہ لینے سے پیشتر ضروری ہے کہ یورپ کے معاشی انقلاب اور جدید جمہوری معاشی نظریات کے ارتقا پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

یورپ کے معاشی انقلابات

پانچویں صدی عیسوی میں رومن سلطنت کے زوال سے جاگیرداری کا آغاز ہوا۔ اس نظام کے تحت اقتدار کی اصل بنیاد جاگیرداری قرار پائی۔ اس سے ایک طرف تو صنعت و تجارت اور علم و فن کی نشو و نما رک گئی، دوسری طرف پیشوں کی بنیاد پر برادری سسٹم کو استحکام حاصل ہوا جو بذاتِ خود صنعتی ترقی کے لیے نقصان دہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ عیسائیوں کے مذہبی پیشواؤں نے اس ظالمانہ اور جابرانہ نظام کا تحفظ اپنا فریضہ خیال کیا۔ کیونکہ اس طرح انھیں بہت زیادہ مادی فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مسلمانوں نے اندلس اور صقلیہ فتح کیے اور یہ علاقے آہستہ آہستہ تہذیب و تمدن کے اعلیٰ ترین مرکز بن گئے جن سے یورپ کی ابھرتی ہوئی اقوام نے بھرپور استفادہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں پہلی مرتبہ علم و فن کو فروغ حاصل ہوا۔ چودھویں سے لے کر سولھویں صدی تک کے زمانے (دورِ متوسط) میں مغربی ممالک کی ترقی کا سلسلہ شروع ہوا۔ پریس کی ایجاد ہوئی۔ علوم و فنون کی وسیع پیمانے پر اشاعت اور درس و تدریس کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ نئی نئی جغرافیائی دریافتیں ہوئیں، تجارت کا میدان وسیع ہوا اور تاجر طبقے نے بتدریج جاگیرداری اور اس کے مذہبی محافظ کلیسائی نظام کی مخالفت میں آگے بڑھنا شروع کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سولھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے جاگیرداری نظام نے بڑی بڑی قومی ریاستوں میں جڑ پکڑ لی اور درمیانہ طبقہ نے قدیم استبدادی نظام کی دھجیاں توڑ ڈالیں۔ اس سمت کامیابی سے عام انسان نے یہ سمجھا کہ اب ظلم و ستم کا دور ختم ہو گیا اور امن و سکون کی سحر طلوع ہو گئی لیکن ہوا یہ کہ مغربی معاشرہ مکمل طور پر مادیت کی لپیٹ میں آگیا۔ سیاست کا رشتہ اخلاق اور مذہب سے کٹ گیا۔ انفرادیت پسندی اپنی انتہائی اور ظالمانہ شکل میں ظاہر ہونے لگی۔ دوسرے انسانوں کے حقوق کی قیمت پر اپنی غرض اور مفاد کا حصول اور تحفظ مقصدِ زندگی قرار پایا اور تجارتی معاملات میں سودی کاروبار کے رواج کو قانونی تحفظ حاصل ہونے کی بنا پر معاشرے کے پورے جسم سے خون سمٹ کر چند مخصوص حصوں میں ذخیرہ ہونے لگا۔ سرمایہ دار طبقہ نے اپنے روز افزوں غلبہ و تفوق کے دوام اور استحکام کے لیے اس بات پر زور دیا کہ کلیسا، ریاست اور معاشرہ کو کسی بھی فرد کے معاشی مفاد اور ترقی کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالنے کا حق نہیں اور اس طرزِ فکر کو آزاد خیالی کی تحریک (LIBERALISM) کا خوبصورت نام دے کر بے قید معاشی نظام کی پیش رفت کا راستہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔

بے قید معاشی نظام

بے قید معاشی نظام کی رو سے شخصی ملکیت انسان کا فطری حق قرار پائی۔ خیال تھا کہ مقابلہ اور مسابقت کے فطری اصول کے مطابق سرمایہ و محنت کے حقوق و فرائض میں توازن پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن اس میں خود غرضی اور انتہا پسندی کے عناصر کا غلبہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جلد ہی اس نظریہ کے نقائص نمایاں ہونے لگے۔ مشینی پیداوار اور بے قید صنعتی و تجارتی ترقی سے بیروزگاری میں اضافہ ہوا۔ محنت کی قیمت گر گئی جس سے مزدوروں نے انجمنوں کی صورت میں منظم ہو کر اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا لیکن سرمایہ دار اور تاجر طبقہ کے پاؤں مغربی معاشرے میں بہت زیادہ مضبوط تھے۔ وقت کا مروج فلسفہ اور ریاست اس کی پشت پناہی میں متحد تھے۔ حکومت اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئی۔ سرمایہ داروں نے خریداران محنت کشوں اور حکومت کے خلاف مضبوط جتھہ بندی کر لی۔ انھوں نے مغربی معاشرہ کی مادیت کو اور جاگیرداری کے خلاف عوام کے زبردست ردعمل کو اپنے مفادات کے لیے خوب خوب استعمال کیا۔ دنیا اور دین کی جدائی کے تصور نے سرمایہ داروں کو معاشی لوٹ کھسوٹ کے لیے کھلی آزادی دے دی اور انھوں نے ذاتی مفاد کے لیے اجتماعی مفادات کو بھینٹ چڑھانے سے کبھی گریز نہ کیا۔ ذخیرہ اندوزی، ایجنسی سسٹم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قیمتوں میں کمی کے ڈر سے پیداوار کو ضائع کر دینا، تعیش کی غرض سے مصنوعات اور مخرب اخلاق اشیا کی تیاری اور استعمال، بادی، سود خواری اور استحصال پسندی وغیرہ لاتعداد برائیاں اس نظام کے بطن سے پیدا ہو گئیں جنھوں نے بالآخر پوری دنیا کو جہنم بنا کر رکھ دیا۔

ردِ عمل

بورژوا طبقے کے ظلم و ستم سے متاثر ہونے والے عوام اور ان کے فکری رہنماؤں نے فکر و نظر کا توازن کھو دیا اور اصل خرابیوں کے مناسب علاج کی جستجو کی بجائے انھوں نے ان فطری قوانین ہی پر حملہ بول دیا جن پر ابتدائے آفرینش سے انسانی تمدن و معیشت کی عمارت تعمیر ہوتی چلی آئی تھی۔ ان کے خیال میں خرابی کی اصل جڑ سرمایہ کا غلط استعمال نہیں بلکہ شخصی ملکیت کا تصور تھا جس نے بڑی بڑی اجارہ داریاں قائم کر کے عوام کی اکثریت کو معاشی محتاجی میں مبتلا کر دیا اور اس سلسلہ میں چونکہ عیسائیت نے ملکیت، جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ نظام کو تحفظ دیا لہٰذا مذہب اور مذہبی رہنما اس معاشی ظلم کے معاون قرار دے کر قابلِ نفرت خیال کیے گئے۔ اس نئے نظریے کے مطابق انفرادیت کی بجائے اجتماعیت پر زور دیا گیا اور تمام ذرائع پیداوار قومی ملکیت میں لیے جانے ضروری خیال کیے گئے۔ اس نظام کو روبہ عمل لانے کے لیے طبقاتی نزاع اور خونیں انقلاب شروع ہو گئے۔

اقبال یورپ میں

تقریباً یہی وہ زمانہ تھا جب اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ روانہ ہوئے۔ آپ تقریباً تین سال تک یورپ میں مقیم رہے۔ دورانِ قیام آپ نے انگلستان اور جرمنی کی مشہور یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ حصولِ تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے وہاں کے معاشروں کا بھی قریب سے مطالعہ کیا اور مستقبل میں رونما ہونے والی بعض سیاسی و سماجی تبدیلیوں کی ابتدائی صورت گری کا مشاہدہ کیا۔

اہلِ مغرب کی خام کاری

پورا یورپ معاشی تبدیلیوں اور ان کے نتائج پر بحث و مباحثہ میں مصروف تھا۔ اقبال معاشرے کے معاشی شعبہ کی خرابیوں کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی بصیرت پر یہ راز آشکار ہو گیا کہ اہلِ مغرب نے انسانیت کو روحانیت سے محروم کر کے جو نظام بنا رکھا ہے وہ ان کے نزدیک مشکلات کا بہترین حل ہو گی ہے لیکن اقبال دیکھ رہے تھے کہ وحی سے محروم اقوامِ مغرب کی یہ روش ایک نئے انقلاب کو جنم دینے والی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ لہٰذا اقبال کیلئے یورپ سے واپس ہندوستان آنے کے چند برس بعد ہی اس انقلاب کے قدموں کی دھمک صاف طور پر سنائی دینے لگی۔

انقلابِ روس

۱۴-۱۹۱۸ء کی جنگِ عظیم اوّل سے فائدہ اٹھا کر روس کی اشتراکی پارٹی نے اکتوبر ۱۹۱۷ء میں لینن کی قیادت میں انقلاب برپا کیا اور اپنے اجتماعی نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کی ہلاکت خیزیوں سے تنگ آئی ہوئی انسانیت نے اشتراکی انقلاب کو امن و انصاف کا سورج قرار دیا۔ دنیا بھر کے اہلِ فکر اصحابِ نظر نے اپنی توجہ اس "سرخ سویرے" کی طرف مبذول کر دی۔ مغربی استعماریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صف آرا تحریکوں کو اس انقلاب سے بے حد تقویت ملی۔ مغربی سامراج نے سمٹنا شروع کر دیا اور تقریباً تمام مغربی ملکوں میں معاشی اصلاح کے پروگرام نافذ ہونے لگے۔

برطانوی استعمار کی مخالفت

ہندوستان بھی مغربی سامراج کا زخم خوردہ تھا۔ ایک عرصے سے برطانیہ نے اس خطۂ زمین کو لوٹ کا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ فوج اور اسلحہ کے بل پر مٹھی بھر انگریزوں نے ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ اس کے باوجود عروسِ آزادی کے طلبگار سر سے کفن باندھ کر میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔ انقلابِ روس نے ہندوستان میں مصروفِ عمل آزادی پسند قوتوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ خاص طور پر دانش ور طبقہ جو انگریزی استعمار اور اس کے استحصالی ہتھکنڈوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ روس سے بہت سی امیدیں لگانے لگا۔ قدرتی طور پر علامہ اقبال بھی عصرِ حاضر کے اس اہم واقعہ کو نظر انداز نہ کر سکے۔

اقبال اور انقلابِ روس

عام دانشور انقلابِ روس سے مرعوبیت کی حد تک متاثر تھے اور اس حالت میں ان کے لیے اس پر تنقیدی نظر ڈالنا تقریباً ناممکن تھا لیکن اقبال کے لیے اس انقلاب کی غیر مشروط تعریف ناممکن تھی ان کی نظریں اسلامی نظام کے احیا کے امکانات کی جستجو میں مصروف تھیں لہٰذا انھوں نے خیال کیا کہ شاید انقلابِ روس سے مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی پیش قدمی رک سکے اور غلام اور پس ماندہ قوموں کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آزادی کی منزل حاصل ہوسکے۔ ان کی نظر میں روس کا اشتراکی نظام ایک منفی نظام تھا جس سے مغربی استعمار کا قلع قمع تو ہوسکتا تھا لیکن وہ اس قابل نہیں تھا کہ دوسرے ممالک بالخصوص مغربی ممالک دینِ اسلام کو چھوڑ کر اس کی تقلید پر کاربند ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد انھوں نے جب اسرارِ خودی (۱۹۱۵ء) شائع کی تو اس میں بھی اسلامی اصولوں ہی کو رہنما قرار دیا اور اس کے تین سال بعد (۱۹۱۸ء) میں جب رموزِ بیخودی شائع کی تو اس میں بھی اپنے اسی عندیے کا اظہار کیا کہ عہدِ حاضر کا امن اور ترقی صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے۔

تاہم علامہ اقبال کے اس دور کے کلام کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک سچے مسلمان اور عاشقِ رسولؐ کی حیثیت سے ان کی ہمدردیاں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے ہاتھوں زخم خوردہ اور پس ماندہ طبقوں کے ساتھ ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ محنت کی عظمت بحال کرنے کے لیے آواز بلند کی ہے انھوں نے اپنی متعدد اُردو اور فارسی نظموں میں مزدوروں کے جذبات و احساسات کی حقیقی ترجمانی کی ہے لیکن اس سے یہ خیال کرنا ہرگز درست نہ ہوگا کہ وہ اشتراکیت کے نقیب بن گئے تھے بلکہ وہ اس طرح انسانیت کے بہی خواہوں کو سرمایہ و محنت کی باہمی آویزش کی اہمیت و شدت سے آگاہ کرنا چاہتے تھے اور یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ معاشی مسئلہ کو نظر انداز کر کے یا اس کی اہمیت کو کم کر کے دنیا میں حقیقی امن اور ایک عادلانہ اجتماعی نظام قائم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ انفرادی و اجتماعی معاملات کا سدھار صرف وحی کی روشنی میں متعین اصولوں کی پیروی ہی سے ممکن ہے۔ اس لحاظ سے اسلام ہی وہ نظامِ مطلوب ہے جو عہدِ حاضر کے جملہ تقاضوں کا مکمل اور برجستہ جواب ہے

خضرِ راہ

"بانگِ درا" اقبال کا پہلا اُردو مجموعہ کلام ہے۔ یہ کتاب اگرچہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی لیکن اس میں وہ تمام منتخب کلام شامل ہے جو اقبال نے اپنی شاعری کے آغاز سے ۱۹۲۴ء کے آغاز تک کہا تھا اس میں وہ نظمیں بھی موجود ہیں جو اقبال نے مختلف اوقات میں انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں سنائیں۔ انہی نظموں میں "خضرِ راہ" بھی شامل ہے۔ اس نظم کا زمانہ تالیف ۱۹۲۱ء ہے۔ اس وقت جنگِ عظیم تو ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے مابعد اثرات ہنوز کارفرما تھے۔ عرب دنیا مختلف ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی جن پر استعماری قوتوں کی کٹھ پتلی حکومتیں قائم تھیں اعلان بالفور کے ذریعے برطانیہ نے یہودیوں کو فلسطین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں صیہونی ریاست کے قیام کے لیے بنیاد فراہم کردی تھی۔ ترکی اندرونی انتشار اور خلفشار میں مبتلا تھا۔ مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھیوں نے انقرہ میں متوازی حکومت قائم کرلی تھی، برائے نام خلافت چند دنوں کی مہمان نظر آتی تھی۔ ادھر ہندوستان میں مسلمان عجیب و غریب سیاسی الجھنوں اور پیچیدگیوں میں مبتلا تھے۔ ان حالات میں اقبال کی یہ نظم بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں اقبال نے مختلف مسائل کے حل کے لیے خضر کے روایتی کردار کا سہارا لیا ہے۔ نظم کا اسلوب ڈرامائی ہے جس میں شاعر کی ملاقات خضر سے ہوتی ہے۔ شاعر خضر سے بین الاقوامی حالات و مسائل میں رہنمائی طلب کرتا ہے۔ وہ اس سے زندگی کی حقیقت، سلطنت کی اصلیت، دنیائے اسلام کی بیداری اور سرمایہ و محنت کی آویزش کے بارے میں سوال کرتا ہے:

اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش ؟ (بانگ درا: ۲۹۰)

خضر سرمایہ و محنت کے سلسلہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے یورپی استعماری طاقتوں کو خبردار کرتا ہے کہ ملوکیت اور نوآبادیاتی طاقتوں کا خاتمہ قریب ہے اور عام آدمی خواب گراں سے بیدار ہو رہا ہے۔ لہٰذا اہل یورپ کی بہتری اسی میں ہے کہ اپنی استحصالی عادتوں کو تبدیل کرلیں۔ خضر مزدور کو پیغام بیداری دیتے ہوئے کہتا ہے:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر — شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات (بانگ درا: ۲۹۷)

لیکن ساتھ ہی محنت کش طبقے کی نادانی کا شکوہ بھی کرتا ہے:

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ — خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے — سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات (بانگ درا: ۲۹۸)

لہٰذا محنت کش طبقے کو خواب غفلت سے بیدار ہو کر سرمایہ داری کے تسلط ناروا سے نجات حاصل کرنی چاہیے:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے۔ (بانگ درا: ۲۹۸)

© rasailojaraid.com

پیام

۱۹۲۳ء میں اقبال نے اپنا فارسی مجموعۂ کلام "پیام مشرق" (در جواب دیوان شاعر المانوی، گوئٹے) شائع کیا۔ اس کے ایک حصے "نقش فرنگ" کی متعدد نظموں میں اقبال نے انسان کے معاشی مسئلہ کے سلسلہ میں سرمایہ کے خلاف محنت کش طبقے کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سرمایہ دار طبقہ جن حیلے بہانوں سے اور عیارانہ فلسفوں سے محنت کش طبقے کو ہمیشہ کے لیے غلام رکھنا چاہتا ہے۔ اب ان کا فسوں نہ چل سکے گا کیونکہ محنت کش خواب غفلت سے بیدار ہو رہا ہے۔ وہ اپنی نظم "پیام" کے ساتویں بند میں اس انقلاب کی خبر یوں دیتے ہیں:

افسرِ پادشہی رفت و بہ یغمائی رفت
نے اسکندری و نغمۂ دارائی رفت

کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست
عشرتِ خواجگی و محنتِ لالائی رفت

یوسفی را ز اسیری بہ عزیزی بردند
ہمہ افسانہ و افسونِ زلیخائی رفت
چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است (پیام مشرق: ۱۹۱-۱۹۲)

صحبتِ رفتگان

اسی کتاب کی ایک نظم صحبت رفتگان (در عالم بالا) میں دورِ جدید کے معاشی مسائل پر حکمائے مغرب کا ایک مکالمہ ہے جس میں روس کا مشہور مصلح اور سرمایہ داری کا دشمن ٹالسٹائی، مشہور المانوی اسرائیلی ماہر اقتصادیات کارل مارکس مصنف "سرمایہ"، مارکس کا پیشرو ہیگل، ایران قدیم کا اشتراکی مزدک اور کوہکن (مزدور) باہم گفتگو کرتے ہیں۔ ٹالسٹائی کہتا ہے کہ ملوکیت کا استحکام فوجی طاقت پر منحصر ہے۔ بادشاہوں کی فوج کا سرگماشتہ شیطان کا خادم ہے کیونکہ وہ اپنے پیٹ کی خاطر بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت، کلیسا اور وطنیت تینوں بے ہوشی کا ایسا دارو (افیون) ہیں جس کو پلا کر حاکم لوگ محکوموں کی جانیں خرید لیتے ہیں:

بارکش اہرمن لشکری شہریار
از پئے نانِ جویں تیغ ستم برکشید

© rasailojaraid.com

زشت بہ چشمش نکوست مغز نداند ز پوست   مردک بیگانہ دوست سینۂ خویشاں درید
دارد اگر بیہشی است تاج، کلیسا، وطن   جان خداداد را خواجہ بجا مے خرید (پیام مشرق: ۱۹۶)

کارل مارکس اس کی تائید میں کہتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں انسان اپنے ہی بھائیوں کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت سے ناآشنا ہو کر حیوان بن جاتا ہے:

راز دان جزو و کل از خویش نامحرم شدہ است
آدم از سرمایہ داری قاتل آدم شدہ است (پیام مشرق: ۱۹۶)

اس پر ہیگل کہتا ہے کہ کائنات کے ظاہری اختلافات و تضادات روشنی و تاریکی، نرمی و سختی، شیرینی و تلخی وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ فطرت نے ان میں کشمکش اس لیے پیدا کر دی ہے تاکہ نظامِ کائنات جاری رہے۔ لہٰذا سرمایہ دار اور مزدور اور حاکم و محکوم کی کشمکش بھی فطری ہے گویا ان کا وجود بھی لازمی ہے۔

جلوہ دہد باغ و راغ معنیٔ مستور را   عین حقیقت نگر حنظل و انگور را
فطرتِ اضداد خیز لذت پیکار داد   خواجہ و مزدور را آمر و مامور را (پیام مشرق: ۱۹۷)

یہ سن کر ٹالسٹائی پکار اٹھتا ہے کہ تو اپنا خود پرست فلسفہ اپنے تک محدود رکھ کیونکہ تو مزدور کو اپنی پس ماندگی پر مطمئن اور قانع رہنے کی تلقین کرتا ہے:

عقلِ دو رو آفرید فلسفۂ خود پرست   درس قناعت دہی بندۂ مزدور را؟ (پیام مشرق: ۱۹۷)

پھر مزدک بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہتا ہے کہ (اشتراکیت کا) جو بیج میں نے ایران کی سرزمین میں بویا تھا وہ روس اور جرمنی میں پھلا پھولا ہے۔ سلطانوں اور امیروں کے محلات میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ اے مزدور! اٹھ اور اس نعمت گم گشتہ (حاکمیت) کو خسرو (آقا) کے ہاتھ سے چھین لے:

دانۂ ایران ز کشتِ زار و قیصر بر دمید   مرگ نو می رقصد اندر قصرِ سلطان و امیر
مدتے در آتش نمرود می سوزد خلیل   تا تہی گردد حریمش از خداوندان پیر
دور پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز   نعمت گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر (پیام مشرق: ۱۹۸)

اس پر کوہکن (مزدور) کہہ اٹھتا ہے کہ سرمایہ دار کی زبان پر تو صلح کے الفاظ ہیں مگر اس کا باطن چنگیز کی طرح خون آشام ہے۔ میں نے اس کی عیاری و مکاری سے تنگ آ کر عقل و خرد کا دامن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چھوڑ دیا ہے اور جنون و دیوانگی اختیار کر لی ہے اور اپنے ساتھیوں سے فریاد کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں اگرچہ میرے تیشے نے پہاڑوں کا سینہ چیر دیا ہے لیکن دنیا میں ابھی تک پرویزیت (ملوکیت) کا دور دورہ ہے۔ کوہکن مزدوروں کو دعوتِ عمل دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اے مزدور! زمین سے لے کر آسمان تک جو کچھ بھی ہے ہمہ تن مصروفِ عمل ہے۔ پس باہمی اتحاد و اتفاق سے کام لے کر جلدی قدم اٹھاؤ کیونکہ کارواں کی رفتار بہت تیز ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم غفلت میں پڑے رہو اور اس طرح عظمت کی منزل تک نہ پہنچ سکو:

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است — ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است

برونِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم — زبانِ او ز مسیح و دلش ز چنگیز است

گسست عقل و جنوں رنگ بست و دیدہ گداخت — درآ بجلوہ کہ جانم ز شوق لبریز است

اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد — ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

ز خاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیماست

قدم کشا کہ رفتارِ کارواں تیز است — (پیامِ مشرق: ۱۹۷-۱۹۸)

حکیمِ فرانسوی و مردِ مزدور

پیامِ مشرق کی ایک اور نظم "محاورہ مابین حکیم فرانسوی آگسٹس و مرد مزدور" ہے۔ کومٹ (یا کونت)، جان اسٹوارٹ، ہربرٹ سپنسر اور ڈارون وغیرہ کا معاصر ہے۔ اس کے فلسفہ کو ایجابیت (POSITIVISM) کہتے ہیں جس کی رو سے انسانی تفکر، مذہب اور مابعد الطبیعات سے گزر کر فطرتِ محسوس کی طرف آ گیا ہے اور یہ اس کی ترقی کی آخری منزل ہے۔ انسانیت کو اب دیوی دیوتاؤں اور خدا و آخرت کے تصور کو چھوڑ کر انسانیت کو دین کی حیثیت سے اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا میں گزرے ہوئے عظیم انسانوں کی پرستش کے دن مقرر کر لینے چاہئیں۔ تمام نوعِ انسان کو ایک جسم سمجھنا چاہیے جس طرح جسمِ انسانی کے ہر عضو کا مخصوص وظیفہ ہے۔ دماغ سوچتا ہے اور پاؤں چلتے ہیں اسی طرح معیشت کے کاروبار میں بھی فطری تقسیم کارفرما ہے، کوئی حاکم ہے کوئی محکوم۔ کوئی مالک ہے اور کوئی اس کا ملازم اور محمود ایسا شہنشاہ، ایاز کی طرح غلامی نہیں کر سکتا وغیرہ۔ زندگی میں تقسیم کار کی بدولت ہی راحت میسر ہوتی ہے۔ گویا انسانی طبقات کی تقسیم اس کے نزدیک عین فطری ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" — ہماں نخل را شاخ و برگ و براند
دماغ از خرد زاست از فطرت است — اگر پا زمیں ساست از فطرت است
یکے کار فرما، یکے کار ساز — نیاید ز محمود کارِ ایاز
نہ بینی کہ از قسمتِ کار زیست
سراپا چمن می شود خار زیست؟ (پیامِ مشرق، ۲۰۴)

اس پر مردِ مزدور کہتا ہے کہ اے حکیم و دانا انسان! تو مجھے اپنے فلسفہ سے فریب دینا چاہتا ہے اور مجھے غلامی کا سبق دے رہا ہے۔ میرے تیشے کی بدولت پہاڑوں سے نہریں رواں ہیں لیکن تو کوہکن کا حق پرویز کو دینا چاہتا ہے۔ سرمایہ دار کا وجود زمین کے کندھوں پر بوجھ ہے۔ وہ کھانے اور سونے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتا۔ پس دنیا کی فارغ البالی اور مسرت کا مکمل انحصار مزدور کی جفاکشی پر ہے۔

فریبی بحکمت مرا اے حکیم — کہ نتواں شکست ایں طلسم قدیم
مس خام را از زر اندودہ؟ — مرا خوئے تسلیم فرمودہ؟
کند بحر را آبنایم اسیر — ز خارا بُرد تیشۂ ام جوئے شیر
حق کوہکن دادی اے نکتہ سنج — بہ پرویز پرکار نا بردہ رنج؟
خطا را بحکمت نگرداں صواب — خضر را نگیری بدام سراب
بدوش زمیں، بار، سرمایہ دار — ندارد گزشت از خور و خواب کار
جہاں راست بہروزی از دستِ مزد — ندانی کہ ایں ہیچ کارہ است دزد
پئے جرم او پوزشش آوردہ؟
بایں عقل و دانش فسوں خوردہ؟ (پیامِ مشرق، ۳۰۵)

لینن و قیصرِ ولیم

"موسیو لینن و قیصرِ ولیم"، کے عنوان سے ایک نظم میں بانیٔ اشتراکیت لینن، المانوی ملوکیت کے آخری نمائندے قیصرِ ولیم سے کہتا ہے کہ طویل مدت سے انسان بھاری چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہا ہے۔ ایک طرف وہ ملوکیت کے فریب میں گرفتار ہے اور دوسری طرف کلیسا کے دام میں اسیر ہے۔ آقا کی قمیص محنت کشوں کے خون سے سرخ ہے۔ بھوکے غلاموں نے تنگ آ کر آقا کی قمیص کو چاک چاک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دیا اور عوام کے غصے کی آگ کے شعلے نے پیرِ کلیسا کی چادر اور سلطان کی قبا کو جلا کر رکھ دیا ہے:

بسے گزشت کہ آدم دریں سرائے کہن — مثالِ دانہ تہِ سنگِ آسیا بودست
فریبِ زاری و افسونِ قیصری خوردست — اسیرِ حلقۂ دامِ کلیسیا بودست
غلامِ گرسنہ دیدی کہ بردرید آخر — قمیصِ خواجہ کہ رنگین زخونِ ما بودست
شرارِ آتشِ جمہورِ کہنہ ساماں سوخت — ردائے پیرِ کلیسا، قبائے سلطاں سوخت (پیامِ مشرق: ۲۰۹)

اس کے جواب میں قیصر ولیم کہتا ہے کہ ملوکیت کا کوئی قصور نہیں دراصل غلامی انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ جب وہ اپنے پرانے خداؤں سے بیزار ہوتا ہے تو خود بخود نئے خدا تراش لیتا ہے۔ رہزنوں کے ظلم و ستم کی شکایت درست نہیں۔ کیونکہ خود رہرو ہی اپنی متاع کے رہزن ہیں۔ اگر تاجِ شاہی جمہور چھین لیں تو ان کی انجمن بھی ہنگاموں سے خالی نہ رہے گی۔ انسان کے دل میں اقتدار کی ہوس مٹ نہیں سکتی۔ یہ آتش دان میں ہمیشہ آگ جلتی رہتی ہے، عروسِ اقتدار جمہور کو غلام بنانے میں ہمیشہ مصروف رہتی ہے۔ شیریں کے ناز اٹھانے والے ہمیشہ موجود رہتے ہیں، اگر خسرو نہیں تو کوہکن سہی:

گناہِ عشوہ و نازِ بتاں چیست — طواف اندر سرشتِ برہمن ہست
دمادم نو خداونداں تراشد — کہ بیزار از خدایانِ کہن ہست
ز جورِ رہزناں کم گو کہ رہرو — متاعِ خویش را خود رہزن ہست
اگر تاجِ کئی جمہور پوشد — ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
ہوس اندر دلِ آدم نہ میرد — ہماں آتش میانِ مرزغن ہست
عروسِ اقتدارِ سحر فن را — ہماں پیچاکِ زلفِ پرشکن ہست
نماند نازِ شیریں بے خریدار — اگر خسرو نباشد کوہکن ہست (پیامِ مشرق ۲۱۰)

سرمایہ دار و مزدور

"قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" ایک طنزیہ نظم ہے جس میں سرمایہ دار مزدور کو اسبابِ معیشت کی بزعمِ خویش منصفانہ تقسیم کا طریقہ بتاتا ہے تاکہ کسی فریق کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ فولاد کے کارخانوں کا شور و غل میرے اور کلیسا کے سہانے سپنے تیرے، دنیا کے نخلستان، کھیت اور درخت میرے لیکن باغِ بہشت، اس کی سدرہ اور طوبیٰ تیری، دردِ سر پیدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے والی شراب میری مگر پاک اور صاف پانی جو آدم اور حوا کا مرغوب مشروب ہے تیرا، مرغابیاں تیتر اور کبوتر میرے لیکن ہما کا سایہ اور عنقا کے پَر تیرے - یہ زمین اور اس کے پیٹ میں جو کچھ ہے میرا اور زمین سے لے کر عرشِ معلیٰ تک سب تیرا :

غوغائے کارخانۂ آہن گری زمن — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا ازانِ تو
نخلے کہ شہ خراج بر و می نہد زمن — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ ازانِ تو
تلخابہ کہ درد سرآرد ازان من — صہبائے پاک آدم و حوا ازانِ تو
مرغابی و تدرو و کبوتر ازان من — ظلِ ہما و شہپر عنقا ازانِ تو
ایں خاک و آنچہ در شکمِ اُو ازان من — از خاک تا بہ عرش معلا ازانِ تو (پیامِ مشرق: ۲۱۵)

نوائے مزدور

اس کے ساتھ ہی ایک نظم "نوائے مزدور" ہے جس میں مزدور کہتا ہے کہ میں خود تو ٹاٹ اور کھدر پہنتا ہوں لیکن میری محنت سے نکما آقا حریر و ریشم کا لباس پہنتا ہے - میں اپنے زورِ بازو سے کان کھودتا ہوں مگر اس سے نکلے ہوئے لعل حاکم کی انگشتری کی زینت بنتے ہیں - میرے بچوں کے آنسو امیر کے گھوڑے کے ساز کے قیمتی موتی ہیں اور کلیسا کی جونکیں میرا ہی خون چوس چوس کر فربہ ہوئی جاتی ہیں، ملوکیت نے بھی میری محنت کی بدولت طاقت و قوت حاصل کی - میری آہ و زاری کے سبب ویران اور بنجر زمین رشکِ گلزار ہے اور میری ہی جفاکشی کے باعث امرا و رؤسا کے چہروں پر تازگی ہے -

(پیامِ مشرق: ۲۱۶)

پھر مزدور کہتا ہے کہ سنو اے دوستو! سازِ کائنات سے نیا نغمہ بلند ہو رہا ہے، نظامِ ملوکیت نزع کے عالم میں ہے - آؤ وہ شراب شیشے میں ڈالیں جو اسے پگھلا دے، آؤ چمن کے رہزنوں سے انتقام لیں اور ان کا قلع قمع کر کے نئی بزمِ غنچہ و گل کی بنیاد رکھیں - تم کب تک پروانوں کی طرح شمع کا طواف کرتے رہو گے اور کب تک اپنی حقیقت سے بیگانہ رہو گے :

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز — مے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے

ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے (پیامِ مشرق: ۲۱۶، ۲۱۷)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طلوعِ اسلام

اقبال کی ان نظموں سے یہ مفہوم اخذ کرنا کہ وہ غیر مشروط طور پر روسی انقلاب کے معترف اور مداح تھے، نادانی اور جہالت ہی نہیں خود شاعرِ مشرق کے ساتھ بھی ظلم اور زیادتی ہے۔ اگر وہ اشتراکیت اور روسی انقلاب کے اتنے ہی معترف اور مداح ہوتے تو ان کی اگلی طویل نظم "طلوعِ اسلام" نہ ہوتی "طلوعِ اشتراکیت" ہوتی۔ "طلوعِ اسلام" (۱۹۲۴ء) علامہ اقبال کی وہ معرکہ آرا نظم ہے جس کے عنوان ہی سے شاعر کی امیدوں، تمناؤں اور ولولوں کا رُخ متعین ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ "خضرِ راہ" کے آخری حصّے میں اقبال نے مسلمانوں کے روشن مستقبل کی جو نوید جانفزا سنائی تھی "طلوعِ اسلام" اس کا تتمہ ہے۔ "طلوعِ اسلام" کا آخری بند اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ اقبال مشرق اور اس میں برپا ہونے والے نوع بنوع انقلابات کی بجائے اسلامی انقلاب کے آثار پر اظہارِ مسرت کر رہے ہیں۔ اور اس امید کا اظہار کرتے ہیں کہ اب مسلمانوں کا عہدِ زوال ختم ہونے والا ہے۔ ان کی اجتماعی زندگی از سرِ نو عروج آشنا ہونے والی ہے:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے (بانگِ درا: ۳۱۱)

تنقیدِ اشتراکیت

"خضرِ راہ" اور "پیامِ مشرق" کی ان نظموں سے کارل مارکس اور لینن کے ہندوستانی مقلدین نے علامہ اقبال کو ایک اشتراکی، انقلابی اور ترقی پسند سمجھنا شروع کر دیا۔ بلکہ ایک مرحلہ پر جب حکومتِ برطانیہ نے کامریڈ غلام حسین کو ۱۹۲۳ء میں بالشویک سازش کے مقدمہ میں گرفتار کیا تو شمس الدین حسن نے اپنے ایک مضمون مورخہ ۲۳ جون میں لکھا کہ "اگر بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کیونکر قانون کی زد سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ بالشویک نظامِ حکومت کارل مارکس کے فلسفہ سیاسیات کا لب لباب ہے اور کارل مارکس کے فلسفہ کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی "خضرِ راہ" اور "پیامِ مشرق" کو بغور دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ ہیں ..." (روزنامہ زمیندار ۲۳ جون ۱۹۲۳ء) اس پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ اقبال نے روزنامہ زمیندار کے مدیر کے نام ایک وضاحتی خط لکھا جو اس اخبار میں ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کو شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے انسان کے معاشی مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں اپنے موقف کو بڑی وضاحت اور صراحت سے اس طرح پیش فرمایا :

"کسی صاحب نے کسی اخبار میں میری طرف بالشویک خیالات منسوب کیے ہیں۔ چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔ میں مسلمان ہوں میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانونِ میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نام تجویز کیا ہے اور فطرتِ انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابلِ عمل بھی ہے۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا میں نے اوپر اشارتاً ذکر کیا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رُو سے وہی راہ آسان اور قابلِ عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔ اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرتِ انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لیے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔

مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے : فاصبحتم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنعمتہ اخوانا" میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریقِ عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔ مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر مجھے امید ہے کہ وہ کوئی ایسا طریقِ عمل، نصب العین اختیار نہ کریں گے جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔" (گفتارِ اقبال، ص ۶ - ۸)

ضروری نکات

علامہ اقبال کے اس مکتوبِ مفتوح سے مندرجہ ذیل نکات اخذ کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ اقبال کے نزدیک اشتراکی خیالات رکھنے والا مسلمان نہیں رہ سکتا۔

۲۔ اقبال مسلمان ہیں اور اسی لیے اقتصادی مسائل کا حل قرآن میں تلاش کرتے ہیں۔

۳۔ ان کے نزدیک سرمایہ ایک ایسی قوت ہے جو بذاتِ خود نہ اچھی ہے نہ بری۔ اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔ یہ اشتراکیت کی غلطی ہے کہ وہ اُسے تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیتی ہے۔

۴۔ قرآن سرمایہ کو مناسب حدود میں رکھنے کے لیے ضبطِ نفس پر زور دیتا ہے اور اس کے لیے اس نے قانونِ خیرات و زکوٰۃ وغیرہ بھی تجویز کیے ہیں، جن پر عمل کرنے سے سرمایہ کا ارتکاز ختم ہو سکتا ہے۔

۵۔ مغربی سرمایہ داری اور اشتراکیت افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ قرآن کے پیش کردہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظام میں مضمر ہے جس میں فرد اور جماعت کے حقوق و فرائض کی منصفانہ تقسیم عمل میں آتی ہے۔

۶۔ مساوات صرف معاشی نہیں بلکہ ہمہ پہلو ہونی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں اخوت قائم کی جائے۔

۷۔ اسلام کا عالمِ انسانیت پر سب سے بڑا احسان "اخوتِ انسانی" کا قیام ہے جس میں مادی امتیازات رنگ، نسل، خون، وطن، زبان، مال اور جاہ و منصب بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں جس میں ترقی کے مساوی مواقع سب کو حاصل ہیں اور زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کی کفالت معاشرے کے ذمہ ہوتی ہے۔

۸۔ روسی اشتراکیت کا مقصد معاشی عدل پسندیدہ ہے لیکن طریقِ کار سراسر ناقص اور خلافِ اسلام ہے۔

۹۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مغربی افکار و نظریات سے متاثر ہونے کی بجائے قرآن مجید کی تعلیمات پر غور و خوض کریں اور اس کی مدد سے وہ اپنی تمام مشکلات کا حل تلاش کریں۔

شریعت و طریقت

حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکامِ الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے اور بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے لیکن ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلۂ فنا کی تفسیر ویدانت اور بدھ مت کے زیرِ اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔

(مکتوب بنام ظفر احمد صدیقی، اقبال نامہ، اول، ۲۰۱)

© rasailojaraid.com